توسیع مساجد کے لئے چندہ کی تحریک اور قادیان سے ناخواندگی کو دُور کرنے کی سکیم

(فرمودہ ۱۹؍ مئی ۱۹۳۹ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

"مَیں نے گزشتہ سے گزشتہ خطبہ جمعہ میں مساجد احمدیہ کے لئے چندہ کا اعلان کیا تھا اور خدام الاحمدیہ کے یہ کام سپرد کیا تھا۔ قادیان میں اُنہوں نے چندہ جمع کرنے کی تو کوشش کی ہے مگر اتفاقاً ان کی ایک لسٹ جو ہمارے گھر میں پہنچی اُسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ گو وہ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں اور میرے خطبات کا مضمون بھی واضح تھا یہ چندہ ایسی نادانی سے جمع کیا گیا ہے کہ تحریک کو ہی ضائع کر دیا ہے۔ اتفاقاً ان کی ایک لسٹ میرے ہاتھ آ گئی جو کسی آدمی نے ہمارے ہاں بھجوائی تھی اِس میں ہر ایک کے نام کے آگے ایک ایک آنہ لکھا تھا حالانکہ مَیں نے یہ کہا تھا کہ ایک آنہ سے لے کر دس روپیہ تک اِس میں دیا جا سکتا ہے مگر ان لوگوں نے غالباً نادانی اور ناتجربہ کاری سے یہ خیال کر لیا کہ خطبہ تو ہر ایک شخص کو یاد ہی ہوگا اور پھر جس کا ارادہ زیادہ دینے کا ہوگا وہ زیادہ دے دے گا۔ ان کی پہلی غلطی تو یہ تھی کہ انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ خطبہ سب کو یاد ہی ہوگا اور دوسری یہ کہ انہوں نے خیال کر لیا کہ جس نے زیادہ دینا ہوگا خود ہی دے دے گا۔ ان کا یہ خیال انسانی فطرت سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ جب کسی سے ایک آنہ مانگا جائے تو

اُس سے یہ امید رکھنا کہ وہ خود بخود دس روپے دے دے گا انسانی فطرت سے ناواقفی ہے۔ شاید سَو میں سے ایک آدمی ایسا ہوگا کہ جو ایک آنہ مانگنے پر بھی دس روپیہ دے دے مگر ننانوے ایسے ہوں گے جو کہیں گے کہ اچھا لے لو ایک آنہ اور ان کی اِس نادانی کا نتیجہ یہ ہؤا ہے کہ سوائے دو چار آدمیوں کے باقی سب نے ایک ایک آنہ ہی دیا ہے۔ حالانکہ جس روز مَیں نے تحریک کی تھی قادیان میں ہی کئی لوگ بیس بیس اور تیس تیس روپیہ دینے کے لئے تیار تھے بلکہ بعض تو سَو سَو دینے پر آمادہ تھے اور جیسا کہ مَیں نے بتایا تھا ایک عورت نے اپنی دوسَو روپیہ کی چوڑیاں دے دی تھیں اور اصرار کے باوجود واپس نہیں لیتی تھیں مگر چندہ میں سب نے ایک ایک آنہ ہی دیا ہے۔ جب وہ فہرست ہمارے گھر پہنچی تو مَیں نے کہا کہ تمہارا وعدہ دس روپیہ کا تھا اِس ایک ایک آنہ سے دھوکا نہ کھانا۔

دوسری غفلت انہوں نے یہ کی کہ بارہ ایک بجے تک مجھ سے کوئی چندہ لینے نہ آیا آخر مَیں نے خود ہی دفتر والوں کو بُلا کر دس روپے بھجوائے اور ساتھ کہا کہ ان کو ملامت کی جائے کہ جب مجھ سے کوئی مانگنے کے لئے نہیں آیا تو مَیں کس طرح سمجھ سکتا ہوں کہ دوسروں سے مانگا گیا ہوگا۔

پس اِس کام میں خدام الاحمدیہ کا طریقِ عمل ناپسندیدہ ہے گو اُنہوں نے چندہ تو کیا ہے مگر معلوم ہوتا ہے دل سے کام نہیں کیا۔ یہ ان کا پہلا کام ہے جو میرے سامنے آیا ہے اور افسوس ہے کہ یہی صحیح طور پر نہیں ہؤا۔ اِس لئے آئندہ مجھے ان کی بہت سی رپورٹوں پر ڈسکاؤنٹ لگانا پڑے گا۔ مَیں امید کرتا ہوں کہ باہر کی جماعتیں اِس غلطی کا ارتکاب نہیں کریں گی۔ چاہئے کہ ہر گھر کے افراد کی فہرست تیار کر لی جائے اور پھر کہا جائے کہ آپ اتنے کس ہیں اور ایک آنہ سے لے کر دس روپیہ فی کس تک چندہ میں دے سکتے ہیں۔ اب آپ اپنے نام کے آگے لکھ دیں کہ کتنا دیں گے اِس طرح تو لوگ زیادہ بھی دینے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں لیکن جب مانگا ہی ایک آنہ جائے اور پہلے ہی سب کے آگے ایک آنہ لکھ کر بھیج دیا جائے تو ہر شخص یہی کہے گا کہ جب سلسلہ کی طرف سے مانگا ہی ایک آنہ گیا ہے تو مَیں زیادہ کیوں دوں؟ مَیں نے تو دس روپیہ یعنی ایک سو ساٹھ آنہ تک کی تحریک کی تھی مگر انہوں نے ایک آنہ کر دیا اور اِس طرح گویا میری نصیحت کا ایک سو انسٹھ حصّہ تلف کر دیا اور صرف ایک حصّہ پر عمل کیا۔ پس مَیں

بیرونی جماعتوں کو ہوشیار کرتا ہوں کہ وہ ایسی نادانی کا ارتکاب نہ کریں بلکہ چاہئے کہ ہر فرد جماعت سے دریافت کریں کہ وہ کتنا چندہ دے گا؟ ایک آنہ سے لے کر ایک سو ساٹھ آنہ تک کوئی جتنا چاہے دے سکتا ہے اِسی طرح اس حد تک وہ اپنے اور اپنے بیوی بچوں کی طرف سے بھی چندہ دے سکتا ہے پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی طرف سے مثلاً دس روپے بیوی کی طرف سے پانچ اور بچوں کی طرف سے چار چار آنہ دے دے۔ غرض یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنا زیادہ اور بیوی بچوں کا کم چندہ دے دے۔ بہرحال جب ایک آنہ سے لے کر دس روپے تک کی تحریک تھی تو خدّام الاحمدیہ کا فرض تھا کہ لوگوں کو موقع دیتے کہ کوئی جتنا چاہے لکھوا دے انہیں خود ہی ایک آنہ چندہ لکھ کر لوگوں کو نہیں بھجوانا چاہئے تھا لیکن انہوں نے خود تو ہر ایک کے نام کے آگے ایک آنہ لکھ دیا اور پھر امید یہ رکھی کہ لوگ زیادہ دے دیں گے۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ عام طور پر لوگوں نے ایک ایک آنہ ہی دیا ہے۔ مَیں نے یہ چندہ کی لسٹ دیکھی ہے اِس سے مَیں اندازہ کرتا ہوں کہ زیادہ دینے والے پانچ سات سے زیادہ نہیں ہیں۔ حالانکہ میری تجویز پر اگر عمل کیا جاتا تو کئی گُنا زیادہ چندہ ہوسکتا تھا اور میرا اندازہ ہے کہ وہ پچاس ساٹھ آدمی جنہوں نے اپنے خیالات کا اظہار مجھ پر کیا تھا ان سے ہی ایک ہزار تک وصول ہوسکتا تھا۔ گو ہم نے ان لوگوں سے زیادہ چندہ لیا نہیں تھا مگر پھر بھی لوگوں کے خیالات کا تو علم ہوسکتا ہے لیکن خدّام الاحمدیہ نے سب کے نام کے آگے ایک ایک آنہ لکھ کر گویا اِس تحریک کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی یا یوں کہو کہ خالی ہڈی رہنے دی مگر اِس میں سے مغز نکال دیا۔ جیسا کہ مَیں نے پہلے بھی کئی بار توجہ دلائی ہے مجھے افسوس ہے کہ جماعت کا نوجوان طبقہ عقل و ذہانت سے بہت کم کام لیتا ہے اور انسانی فطرت کا بہت کم مطالعہ کرتا ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں جب موقع ملے گپیں مارتے رہتے ہیں اور غور وفکر کی عادت نہیں ڈالتے اور زیادہ گپیں مارنے اور باتیں کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سوچ نہیں سکتے کیونکہ جب زبان بولتی ہے تو دماغ کام نہیں کرسکتا۔ اسلام نے ذکرِ الٰہی کا حُکم اسی لئے دیا ہے کہ جب انسان خاموش ہو تو دماغ کام کرتا ہے۔ جس وقت انسان باتیں کر رہا ہو اُس وقت اس کے مدّنظر یہ بات ہوتی ہے کہ سُننے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ دلچسپی کا سامان ہو۔ اِس لئے دماغ کو سوچنے کی طرف توجہ نہیں ہوتی لیکن ذکرِ الٰہی کے وقت چونکہ

لوگوں کی طرف توجہ نہیں ہوتی اِس لئے دماغ کو سوچنے کی طرف توجہ ہوتی ہے اور ذہن ترقی کرتا ہے۔ تو زیادہ باتیں کرنا فکر کی عادت کو کم کرتا ہے اور ہمارے نوجوان چونکہ یا تو باتیں کرتے ہیں اور یا پھر سوتے اور کھاتے ہیں اِس لئے دماغ کی طاقت کو بڑھانے کا ان کو بہت کم موقع ملتا ہے اور انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کرنے کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ وہ اِس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کس طرح کسی کو نیکی کی تحریک کرنا زیادہ مُفید ہو سکتا ہے؟ کس طرح انسانی ذہن کو سلسلہ کی ضروریات کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ کیا جا سکتا ہے؟ کس طرح اصلاح کے لئے آسانی سے تیار کیا جا سکتا ہے؟ وہ صرف باتیں ہی کرنا جانتے ہیں اور باتیں کرنے سے ہی سمجھ لیتے ہیں کہ کام ہو جائے گا۔ حالانکہ دُنیا میں کام باتیں کرنے والے نہیں بلکہ سوچنے والوں نے کیا ہے۔ پس ذکرِ الٰہی کی عادت، مراقبہ اور فکر سے کام لینا انسانی دماغ کو طاقت دینے اور کام میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ سوچنے اور فکر کرنے سے کام میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ دیکھو وہ بھی معمار ہی تھے جنہوں نے تاج محل کا روضہ تعمیر کیا اور وہ بھی معمار ہی ہیں جنہوں نے دارالصحت کے مکان بنائے ہیں اُنہوں نے بھی اینٹ پر اینٹ رکھی اور اِنہوں نے بھی مگر ایک نے فکر سے کام لے کر تحسینِ عمل پیدا کی اور تاج محل بنا دیا اور دوسرے نے غور وفکر سے کام نہ لے کر اپنے کام کو خوبیوں سے عاری کر دیا۔ کام تو دونوں کا ایک ہی ہے مگر ایک نے فکر سے کام لے کر اِس میں خوبصورتی پیدا کی اور دوسرے نے ایسا نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے کاموں میں اتنا ہی فرق ہو گیا جتنا دارالصحت کے مکانات اور تاج محل میں ہے۔ ایک نے ایسا مکان بنایا کہ اگر مُفت بھی رہنے کو دیا جائے تو انسان پسند نہیں کرے گا کہ اِس میں رہے لیکن دوسرے نے اِس میں ایسی خوبصورتی پیدا کی کہ اگر صرف دیکھنے کے لئے پانچ دس روپے ٹکٹ ہو تو لوگ شوق سے دیکھیں گے۔ بعض لوگ یورپ اور امریکہ سے اِسے دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ وہاں وہ رہ نہیں سکتے صرف دس پندرہ منٹ پھرتے ہیں یا ایک دو فوٹو لے لیتے ہیں مگر صرف اس کے لئے وہ ہزار ہا روپیہ خرچ کرتے ہیں کہ تاج محل کو نگاہ بھر کر دیکھ سکیں۔ تو یہ حُسنِ کار کا نتیجہ ہے۔ معمار نے فکر کر کے اِس ترتیب سے اینٹیں رکھیں کہ دیکھنے والوں کو آنکھوں کی لذت اور دل کا سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ کام بھی معمار کا ہی ہے اور دوسرا بھی معمار کا ہی ہے۔

جس کے پاس سے انسان چپ چاپ گزر جاتا ہے اور اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ اِسے دیکھے۔ ہر فن کا یہی حال ہے۔ کاتب ہیں جو کتابت کرتے ہیں ان کی انگلیاں بھی ویسی ہی ہیں جیسی دوسرے لوگوں کی لیکن وہ اتنا خوبصورت لکھتے ہیں کہ خواہ مخواہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے مگر بعض دوسرے لوگ ایسا گندا لکھتے ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود نہیں پڑھا جاتا۔ اِس کی وجہ صرف یہی ہے کہ کاتب لکھتے وقت سوچتا ہے ہر لفظ اور ہر نقطہ کو دیکھتا ہے کہ یہ مجھے اچھا لگتا ہے یا نہیں۔ اگر میری آنکھوں کو اچھا نہیں لگتا تو پڑھنے والوں کو کیونکر اچھا لگے گا وہ ہر لفظ پر غور کر کے اِس میں ایک حُسن پیدا کرتا ہے۔ دِلّی کے ایک کاتب میر پنجہ کش گزرے ہیں جن کا ہر حرف ایک روپیہ قیمت پاتا تھا وہ اگر کسی فقیر پر مہربان ہوتے تو اسے ایک حرف لکھ دیتے تھے کسی کو ب کسی کو ت کسی کو ج اور فقیر اِسے لے جا کر جامع مسجد کے نیچے بیچ دیتے تھے۔ لوگ بڑے شوق سے ایک ایک حرف ایک ایک روپیہ میں خرید کر گھروں میں بطور زینت لگاتے تھے اور پھر ایسے بھی لکھنے والے دُنیا میں موجود ہیں کہ جن کا خط دیکھ کر ہی سر میں درد شروع ہو جاتا ہے اور یہ بھی پتہ نہیں لگتا کہ یہ کسی آدمی نے لکھا ہے یا کوئی کیڑا سیاہی میں سے گزر گیا ہے۔ لاکھ سر پٹکو وہ پڑھا ہی نہیں جاتا بلکہ دردِ سر سے بھی بڑھ کر زحمت اُٹھانی پڑتی ہے۔ مَیں نے دیکھا ہے بعض خطوط ایسے آتے ہیں کہ گھنٹوں لگے رہتے ہیں پھر بھی کچھ پتہ نہیں لگتا پہلے میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں پھر دفتر والوں سے کہتا ہوں کہ اِس کا مطلب نکالو اور پھر بعض اوقات سارے زور لگاتے ہیں مگر لفظ پڑھا نہیں جاتا۔ اگرچہ لکھنے والے نے اپنی طرف سے بڑی محنت سے لکھا ہوتا ہے۔

تو کوئی چیز دُنیا میں ایسی نہیں کہ جسے حسنِ تفکر سے تزئین حاصل نہ ہو اور خدّام الاحمدیہ نے اس کام میں جو غلطی کی ہے وہ بھی اِسی وجہ سے ہے کہ انہوں نے حُسنِ تفکر سے کام نہیں لیا اور مَیں اِس بات کو پبلک میں بیان نہ کرتا اگر بیرونی جماعتوں سے بھی ایسی ہی غلطی کا ڈر نہ ہوتا اور اگر اِس واقعہ سے نصیحت کا کام نہ لینا ہوتا۔ مَیں نے خدّام الاحمدیہ کو پہلے بھی نصیحت کی تھی کہ ذہانت پیدا کریں اور پھر مرکزی مجلس کو تو سب سے زیادہ اِس کا ثبوت دینا چاہئے لیکن اِس کام میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی عہدیداروں نے دخل ہی نہیں دیا محلّہ والوں پر ہی چھوڑ دیا ہے۔

اِس موقع پر مَیں پھر اِن کو توجہ دلاتا ہوں کہ ذہانت اور عقل سے کام لینا انتہائی قومی

ضرورتوں میں سے ہے اِس لئے ذہانت کو تیز کریں اور جب ذہانت پیدا ہو جائے اور عقل تیز ہو تو ہزار ہا نئے رستے نکل سکتے ہیں۔ دُنیا میں کئی قومیں ہیں اور سب کے ایک ہی جیسے ہاتھ اور مُنہ اور آنکھیں وغیرہ ہیں مگر بعض ان میں سے حاکم ہیں اور بعض محکوم۔ حاکم وہی ہیں جو ذہانت سے کام لیتی ہیں۔ شدّتِ ذہانت ایک ایسی طاقت ہے جو قوم کو غالب کر دیتی ہے اور جب اِس کے ساتھ قوتِ عملیہ بھی شامل ہو جائے تو ایسی قوم کا دُنیا کی حاکم بن جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ مَیں نے دیکھا ہے ہندوستانی ہمیشہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ انگریز صرف چار کروڑ ہیں اور چھ ہزار میل سے آکر ہمارے مُلک پر حکومت کر رہے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ انگریزوں کو اِس کی توفیق کیسے ملی؟ آخر کوئی چیز تو ان میں ایسی تھی جس کی وجہ سے انہیں یہ فضیلت حاصل ہوئی۔ یونہی تو اللہ تعالیٰ ایک قوم کی آزادی چھین کر دوسری کو اس کا حاکم نہیں بنا دیتا۔ آخر اِس کی وجہ ہونی چاہئے۔ ہندوستانی سپاہی ہمیشہ برطانوی سپاہیوں کو بُرا بھلا کہتے اور گالیاں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بُزدل ہوتے ہیں۔ ہمارے برابر لڑائی نہیں لڑ سکتے۔ صوبوں کے گورنر اور دوسرے افسر بھی ہندوستانی سپاہیوں کی تعریف میں بڑی دھواں دھار تقریریں کرتے اور کہتے ہیں کہ وہ بہت وفادار ہوتے ہیں، بہادر ہوتے ہیں اور بے شک وہ تنخواہ لیتے اور لڑتے ہیں اور مرتے بھی ہیں لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر گورا سپاہیوں کو گالیاں دیتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ جنگ کے موقع پر صابن پی لیتے ہیں تا بیمار ہو جائیں اور لڑائی میں شریک ہونے سے بچ جائیں مگر ہم دلیری کے ساتھ لڑتے ہیں۔ یہ باتیں ہمیشہ سے سُننے میں آتی ہیں اور ہم بھی بچپن میں یہ سُنا کرتے تھے اور آج تک سُن رہے ہیں مگر مَیں نے جونہی ہوش سنبھالا یعنی دس گیارہ سال کی عمر سے ہی یہ سوال کرنا شروع کر دیا کہ اگر وہ ایسے ہی بُزدل ہیں تو تم پر حکومت کس طرح کرتے ہیں؟ ان کے اندر کونسی ایسی خاص بات ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے مُلک پر قابض ہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ وہ بُزدل ہوں یا کچھ ہوں اِس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے اندر ذہانت ضرور موجود ہے اور یہ بھی ایک قسم کی بہادری ہے۔ دُنیا میں مختلف قسم کی بہادریاں ہیں اور مُشکل وقت پڑنے پر نہ گھبرانا اور اِس کے حل کا کوئی نہ کوئی رستہ تلاش کر لینا یہ بھی ایک قسم کی

بہادری ہے۔ پھر ہندوستانی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارا مُلک اتنا وسیع ہے یہاں سب چیزیں بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔ غلہ اور کپاس وغیرہ خام اشیاء انگریز یہیں سے لے جاتے ہیں اور پھر ان سے مختلف چیزیں تیار کر کے ہمیں کولُوٹتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ان کو اِس طرح لوٹنے کی طاقت کیسے حاصل ہوئی؟ یہ تو ہوا نہیں کہ فرشتوں نے آ کر ہندوستانیوں کے ہاتھ پیر باندھ کر انہیں انگریزوں کے آگے پھینک دیا ہو یا اگر فرشتوں سے ایسی بات منسوب نہ کی جاسکے تو شیطانوں نے ہندوستان فتح کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا ہو۔ ہندوستان نہ فرشتوں نے حوالے کیا اور نہ شیطانوں نے بلکہ انگریزوں نے خود اسے حاصل کیا اور ہم یہ مان لیتے ہیں کہ انہوں نے لڑائی سے اسے فتح نہیں کیا مگر عقل سے تو کیا ہے۔ انہوں نے عقل سے ہی اپنی فوقیت اور برتری ثابت کر دی اور اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ گو ہمارے ہاتھ سے ان کا ہاتھ اچھا نہیں مگر ہمارے دماغ سے ان کا دماغ ضرور اچھا ہے۔ یہ بھی ایک زبردست فضیلت ہے۔ ہندوستانی کہتے ہیں کہ انگریز چالاکی سے جیت جاتے ہیں مگر چالاکی کیا ہے؟ ذہن کی تیزی کا نام چالاکی ہے اور ہاتھ کی تیزی زیادہ اچھی ہے یا ذہن کی؟ ایک شخص اچھا گورنر ہے مُلک کو قابو رکھ سکتا ہے، مقدمات کا اچھا فیصلہ کرسکتا ہے اور ایک شخص اچھا دبا سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں سے کس کی قیمت زیادہ ہوگی؟ اچھے گورنر، اچھے فلاسفر، اچھے جج کی یا اچھے دبانے والے کی؟ اگر تو دبانے والا زیادہ قیمتی وجود ہے تو بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انگریز اچھی تلوار نہیں چلا سکتے اِس لئے ہم ان سے افضل ہیں لیکن اگر دماغی قابلیت کی قیمت زیادہ ہے تو جب ہم کہتے ہیں کہ انگریز کا ہاتھ ہمارے ہاتھ سے اچھا نہیں اور پھر یہ حقیقت ہے کہ وہ ہمارے حاکم ہیں تو اِس کے صاف معنے یہ ہیں کہ ہم ان کی ایسی فضیلت کا اعتراف کرتے ہیں جو وہ خود بھی بیان نہیں کرتے مگر تم یہ کہہ کر کہ انگریز بُزدل ہیں بہت خوش ہوتے ہو کہ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ حالانکہ جب تم یہ کہتے ہو کہ فلاں قوم لڑائی میں اچھی ہے مگر ذہین نہیں تو یہ بہت کم تعریف ہے لیکن جب یہ کہتے ہو کہ لڑائی میں اچھی نہیں مگر ذہین بہت ہے تو اِس کی بہت زیادہ تعریف کرتے ہو۔ اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص کے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی تھے وہ ان کو لے کر میرے مکان پر آیا مجھے باندھ دیا اور مال اسباب لے کر چلا گیا تو اِس میں گھر والے کی کوئی ذلّت نہیں اور جس نے لُوٹا

اُس کی کوئی عزت اور خوبی نہیں سوائے اِس کے کہ اِس کے ساتھ ایک جتھا تھا لیکن اگر وہ اِس طرح کہے کہ میرے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی تھے اور وہ اکیلا تھا مگر چالاکی کے ساتھ ہمیں شکست دے گیا تو اِس میں حملہ آور کی عزت ہوگی ذلت نہیں۔ اِسی طرح انگریزوں کا بہت تھوڑی تعداد کے باوجود ہندوستان کو فتح کر لینا ان کی ذہانت کا ثبوت ہے اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ غیر معمولی ذہانت نے ہی انگریزوں کو غلبہ دلوایا ہے اور اب یہی جرمنی کو آگے بڑھا رہی ہے۔ اِسی کی وجہ سے جاپان ترقی کر رہا ہے اور اِسی کے طفیل تُرکوں نے ترقی کی۔ ان میں ایک ذہین آدمی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا جس نے تمام قوم کو اوپر اُٹھا دیا تو ذہانت قومی ترقی کے لئے بہت ضروری چیز ہے۔ اِس لئے ہر کام سوچ اور فکر سے کرنا چاہئے اور سوچ لینا چاہئے کہ کس طرح کسی کام سے زیادہ بہتر اور مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں؟

دوسری بات جس کی طرف مَیں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مَیں نے قادیان میں ناخواندگی کو دُور کرنے کی تحریک کی تھی جو رپورٹیں اِس کے متعلق مجھے پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ پڑھنے سے گریز کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے پڑھ کر کیا نوکریاں کرنی ہیں؟ خدّام الاحمدیہ کو ایسی باتوں سے گھبرانا نہیں چاہئے دُنیا میں کبھی کوئی ایسی سکیم نہیں ہوئی جسے سب کے سب لوگ قبول کر لیں۔ کچھ نہ کچھ مخالف ضرور ہوتے ہیں اور اِس تحریک میں تھوڑی سی مخالفت برکت کا موجب ہوتی ہے۔ حضرت خلیفۂ اوّل سُنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے ایک نیک تحریک کی کچھ روز کے بعد آپ اس سے ملے تو دریافت کیا کہ کیا اس تحریک کو کامیابی ہو رہی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں کئی لوگوں کی طرف سے اس کی پسندیدگی کے خطوط آ رہے ہیں لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی برکت والی تحریک نہیں۔ آپ نے پوچھا کہ کیوں؟ تو اُس نے کہا کہ کسی نے اِس کی مخالفت نہیں کی۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو بھی باتیں ہوتی ہیں ان کے پیش کرنے والوں کو لوگ گالیاں دیتے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد وہ شخص آپ کو پھر ملا اور کہنے لگا کہ اب مَیں اِس تحریک کو بابرکت سمجھتا ہوں کیونکہ مغلّظات سے بھرا ہوا ایک خط آیا ہے۔ تو کسی نیک تحریک میں مخالفت برکت کا موجب ہوتی ہے اور اس تحریک کی جو مخالفت ہوئی ہے یہ ثبوت ہے اِس امر کا کہ جماعت میں مرض پیدا ہو رہا ہے جس کے علاج

کی طرف ہمیں توجہ کرنی چاہئے اور وقت پر مرض کا علم ہو جانا بھی برکت ہے۔ کیونکہ اِس صورت میں علاج ممکن ہوتا ہے۔ بہت سی بیماریوں کا علاج اِس لئے نہیں ہوسکتا کہ بروقت علم نہیں ہوتا اور اِس مخالفت کا پیدا ہونا ہمیں اِس طرف متوجہ کرتا ہے کہ ہمیں زیادہ محنت اور کوشش سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پس خدّام الاحمدیہ بجائے اِس مخالفت سے گھبرانے کے زیادہ شوق اور محنت سے کام کریں۔ ایسے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کریں، پہلے محلوں کے ممبر سمجھائیں اگر اُن کا اثر نہ ہوتو عہدہ دار ایسے لوگوں کے پاس جائیں یہ بھی بے اثر ہوتو دوسرے بزرگوں کے وفد خدّام الاحمدیہ والے لے جائیں جو ان لوگوں کو سمجھائیں اور ان کو چھوڑیں نہیں جب تک کہ قائل نہ کرلیں۔ اگر اپنے آدمیوں کو بھی ہم قائل نہیں کرسکتے تو اِس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی کمزوری کا خود اعتراف کرتے ہیں۔ کمزور لوگ ہر وقت اور ہر زمانہ میں ہوتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں بھی منافق لوگ موجود تھے۔ پھر بعض لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو چھوڑ دینا چاہئے لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ کمزوروں کو دیکھ کر گھبرانا غلطی ہے مگر اِس بات پر مطمئن ہو جانا کہ ایسے لوگ ہر زمانہ میں ہوتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں بھی تھے اِس سے بھی بڑی غلطی ہے اگر پہلے سلسلوں میں کمزور لوگ رہے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی تو ہے کہ اِس زمانہ کے بزرگوں نے کبھی ان کے وجود کو اطمینان کے ساتھ گوارا نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ان کی اصلاح میں لگے رہتے تھے اِسی طرح ہمیں بھی اِس کوشش میں لگے رہنا چاہئے کہ وہ بچ جائیں۔

پس تعلیمی سکیم کی مخالفت سے خدّام الاحمدیہ کو گھبرانا نہیں چاہئے بلکہ مخالفوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ پہلے خدّام خود سمجھائیں اگر اس کا اثر نہ ہوتو پھر پریذیڈنٹ اور سیکرٹری وغیرہ ان کے پاس جائیں اور سمجھائیں۔ اِس سے بھی فائدہ نہ ہوتو سلسلہ کے دوسرے بزرگ جائیں اور پھر بھی اگر نتیجہ خاطر خواہ نہ پیدا ہوتو مجھے لکھا جائے کیونکہ اتنی کوشش کے باوجود بھی جس کی اصلاح نہ ہو اس کی نسبت سمجھنا چاہئے کہ اس کی بیماری اِس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہ جماعت سے الگ کیا جانے کے قابل ہے۔ پس مخالفت کی وجہ سے مایوس نہیں ہونا چاہئے اور نہ اِس بات سے مطمئن ہونا چاہئے کہ کمزوروں کا وجود لازمی ہے۔ بے شک ان کا وجود لازمی ہے مگر ان کی اصلاح کی کوشش اِس سے بھی زیادہ ضروری اور لازمی ہے۔" (الفضل ۲۴ مئی ۱۹۳۹ء)